حکیم الامّت علامہ محمدؐ اقبال کے نام

دوسرا خط

ڈاکٹر جاوید اقبال

محترم ڈاکٹر جاوید اقبال کی خودنوشت ''اپنا گریبان چاک'' کئی اعتبار سے ایک اہم کتاب ہے۔ اس میں انھوں نے اپنے والد گرامی علامہ اقبال کو دوسرا خط تحریر کیا ہے۔ علامہ اقبال کو ڈاکٹر جاوید اقبال نے بچپن میں خط لکھا تھا۔ جس میں انھوں نے باجالانے کی فرمایش کی تھی۔

دوسرے خط میں ڈاکٹر جاوید اقبال نے پاکستان اور مسلم قومیت (دوقومی نظریے) کے مباحث پر اظہار خیال کیا ہے۔

محترم پروفیسر فتح محمد ملک نے بھی اپنے مقالات میں اسی صورت حال کا تجزیہ کیا ہے۔ ڈاکٹر جاوید اقبال کا خط اور پروفیسر فتح محمد ملک کا اس دور کی صورت حال کا تجزیہ دونوں قارئین کی نذر ہیں۔

(مدیر)

میں نے تقریباً سات برس کی عمر میں اپنے والد کو پہلا خط لکھا تھا جب اُنھیں انگلستان سے گراموفون باجا لانے کی فرمایش کی تھی۔ اتنی مدت گزر جانے کے بعد اب انھیں دوسرا خط تحریر کر رہا ہوں۔ اس مرتبہ وہ اگلے جہان میں ہیں اور مجھے اپنے قومی تشخص اور ''اسلامی'' ریاست کے بارے میں ان سے رہبری لینا مقصود ہے۔

والد مکرم۔ السلام علیکم!

نئی نسل کے نمایندے کی حیثیت سے میں آپ کی اجازت کے ساتھ چند سوال کرنا چاہتا ہوں۔ ہم مسلمانوں کے قومی تشخص کے بارے میں آپ کی جو بحث مولانا حسین احمد مدنی کے ساتھ ہوئی تھی اس میں مولانا مدنیؒ کا موقف تھا کہ قومیں اوطان سے بنتی ہیں، لہٰذا برصغیر کے مسلمانوں کی قومیت تو ہندی ہے البتہ ملت کے اعتبار سے وہ مسلم ہیں۔ آپ نے ان سے اختلاف کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ ''قوم'' اور ''ملت'' کے ایک ہی معانی ہیں۔ مسلم قوم وطن سے نہیں بلکہ اشتراک ایمان سے بنی ہے۔ اس اعتبار سے اسلام ہی مسلمانوں کی ''قومیت'' ہے اور ''وطنیت'' بھی۔ اپنے نظریے کی وضاحت کرتے ہوئے آپ نے چند اہم مثالیں بھی دی تھیں: یہ کہ رسول اکرم ﷺ اگر اپنے وطن سے ہجرت نہ کرتے اور کفار مکہ کے ساتھ تصفیہ کر لیتے کہ نسل، زبان اور علاقے کے اشتراک کی بنا پر ایک ہوتے ہوئے وہ اپنے خداؤں کی پرستش جاری رکھیں اور مسلمان اپنے خدا کی پرستش کرتے رہیں گے، تو آنحضور ﷺ سب سے پہلے عرب نیشنلسٹ قرار پاتے، پیغمبر اسلام ﷺ نہ ہوتے۔ پھر آپ نے فرمایا کہ مدینہ ہجرت کرنے کے بعد آنحضور ﷺ نے ''مہاجرین'' اور ''انصار'' کو اشتراکِ ایمان کی بنیاد پر ایک ''امت''، ''ملت'' یا ''قوم'' بنا دیا۔ پس ملت اسلامیہ وطن سے نہیں بلکہ اشتراک ایمان سے وجود میں آئی ہے۔ آپ نے مولانا مدنیؒ سے اختلاف کے دوران، بالخصوص اپنے اشعار میں، نہایت تلخ لہجہ اختیار کیا۔

عجم ہنوز نداند رموزِ دیں ورنہ
ز دیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی است
سرود برسر منبر کہ ملت از وطن است
چہ بے خبر ز مقام محمدؐ عربی است

آپ کی تحریروں سے واضح ہے کہ آپ علاقائی ''قومیت'' اور ''وطنیت'' کے مخالف تھے۔ لیکن

اس کے باوجود آپ نے فرما رکھا ہے کہ مسلم اکثریتی ملکوں میں اسلام اور نیشنلزم ایک ہی سمجھے جاتے ہیں۔ مشکل وہاں پیدا ہوتی ہے جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں اور نیشنلزم کا تقاضا ہے کہ وہ اکثریتی جماعت میں مکمل طور پر مدغم ہو جائیں۔

پھر آپ نے دنیائے اسلام میں متفرق قومی ریاستوں کے وجود کو تسلیم کرتے ہوئے یہ بھی فرما رکھا ہے کہ اُن قومی ریاستوں کو چاہیے کہ پہلے اپنے قدموں پر مضبوطی سے کھڑی ہوں اور بعد ازاں اشتراکِ ایمان اور تمدنی ہم آہنگی کی بنیاد پر جمہوریتوں کے ایک زندہ خاندان کی طرح اکٹھی ہو جائیں۔

آپ کے مغربی نقادوں میں سے معروف مستشرق ایچ اے آر گب آپ کے سیاسی فکر پر تبصرہ کے دوران تعجب کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں: حیرت کی بات ہے کہ اقبال علاقائی قومیت کے شدید مخالف ہوتے ہوئے برصغیر میں مسلمانوں کے لیے علیحدہ وطن کی تحریک میں پیش پیش تھے۔ بلکہ ان کے حامی تو برملا کہتے ہیں کہ قومیت یا وطنیت کے بارے میں جو کچھ اقبال کہتے ہیں ضروری نہیں کہ وہ اسے تسلیم بھی کرتے ہوں۔

آپ نے اپنے سیاسی فلسفے کے ذریعے اشتراکِ ایمان کی بنیاد پر مسلم قومیت کا تصور پیش کر کے برصغیر میں ''دوقومی نظریہ'' کی حقیقت کو تقویت بخشی۔ چنانچہ پہلے مسلم قوم وجود میں آئی اور پھر اس قوم کے لیے وطن بصورت پاکستان حاصل کر لیا گیا۔ ظاہر ہے اگر اشتراکِ ایمان کی بنیاد پر مسلم قوم وجود میں نہ لائی جاتی یا اسلام سے ایک قومیت ساز قوت کے طور پر کام نہ لیا جاتا تو ''دوقومی نظریہ'' کی حقیقت کو کوئی تسلیم نہ کرتا اور اس کی بنیاد پر پاکستان نہ بن سکتا۔ بلکہ کشمیر کو پاکستان کا حصہ سمجھنے میں بھی یہی جذبہ کام کر رہا ہے۔

پاکستان نے ایک ''مقتدر''، ''قومی'' اور ''علاقائی'' ریاست کی حیثیت سے اقوام متحدہ کی رکنیت حاصل کی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اپنی نظریاتی اساس کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے پاکستان نے اقوام متحدہ میں مسلم امّہ کی کوکھ سے نکلی ہوئی کئی قومی ریاستوں کی نوآبادیاتی طاقتوں سے آزادی کی خاطر تگ و دو میں حصہ لیا۔ فلسطین کی آزادی اور کشمیر کے مسئلے کے حل کے لیے کوششیں جاری رکھیں۔ نیز او آئی سی میں ہمیشہ بڑا فعال کردار ادا کیا۔ جب کبھی دو مسلم قومی ریاستوں میں لڑائی ہوئی تو پاکستان نے ہمیشہ ''نیوٹرل'' پوزیشن اختیار کی۔ افغانستان سے غیر مسلم حملہ آوروں کی فوجوں کو نکالنے کی خاطر پاکستان نے افغان مجاہدین کے شانہ بشانہ جنگ میں حصہ لیا۔ بعدازاں پاکستان ہی کی مدد سے وہاں مسلمانوں کی حکومت قائم ہوئی اور اسے تسلیم کیا گیا۔ پھر وہ مرحلہ آیا جب افغانستان پر ایک بار پھر غیر مسلم حملہ آور ہوئے۔ مگر اس مرتبہ پاکستان نے نہ صرف غیر مسلم حملہ آوروں کے ساتھ اتحاد کیا بلکہ مسلم افغانستان کے خلاف غیر مسلموں کی امداد کی اور افغان مسلمانوں کی تباہی کو ہم ''سب سے پہلے

پاکستان'' کا نعرہ بلند کرتے خاموشی سے دیکھتے رہے۔

اے پدرِ محترم! اگر اب ہماری اجتماعی شناخت کے لیے وہ علاقہ مختص ہو گیا جسے ''پاکستان'' کہتے ہیں اور جس کا مفاد ہمیں سب سے زیادہ عزیز ہے تو پھر مولانا حسین احمد مدنی کا قول کس اعتبار سے غلط ہوا؟ کیا ہمارے عمل سے یہ ثابت نہیں ہو گیا کہ قومی یا وطنی اعتبار سے تو ہم پاکستانی ہیں اور ''ملی'' اعتبار سے مسلم؟ گویا ہمارے نزدیک اگر قومی مفاد یا مصلحت عامہ کے تحت ضروری ہو تو ہم کسی مسلم قومی ریاست کے خلاف غیر مسلموں کے ساتھ اتحاد بھی کر سکتے ہیں؟ اس مسئلے پر ذہن میں الجھاؤ ہے۔ کیسے دور کیا جائے؟

دوسری بات یہ ہے کہ پاکستان ''دوقومی نظریہ'' کی بنیاد پر وجود میں آیا اور جب تک بھارت اور پاکستان جغرافیائی طور پر علیحدہ مملکتوں کی صورت میں قائم رہتے ہیں، ''دوقومی نظریہ'' ان کے درمیان حدِ فاصل رہے گا۔ مگر کیا پاکستان کے اندر بھی ''دوقومی نظریہ'' کو ایک حقیقت کے طور پر زندہ رکھنا ضروری ہے؟ کیا پاکستان میں ایک قوم آباد ہے یا دو قومیں؟ کیا پاکستان میں مسلم اکثریت کو اپنے تحفظ کی خاطر غیر مسلم اقلیت سے امتیاز روا رکھنا چاہیے؟

اے پدرِ محترم! آپ نے فرما رکھا ہے کہ ''علیحدہ نیابت'' کا اصول برصغیر میں مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کی خاطر نافذ کیا گیا۔ لیکن اگر صوبوں کی تقسیم جماعتوں کے مذہبی اور تمدنی رجحانات کو مدِ نظر رکھ کر کی جائے تو مسلمانوں کو خالصتاً ''مخلوط'' انتخابات پر کوئی اعتراض نہ ہوگا۔

پس اگر وقت کے بدلتے تقاضوں کے تحت قومی ہم آہنگی برقرار رکھنے کی خاطر مخلوط انتخابات کا نظام رائج کر دیا جائے یا پاکستانی قومیت اور وطنیت کے جذبات کو فروغ دینے کی خاطر مثبت اقدام اٹھائے جائیں تو کیا پاکستان ''اسلامی'' مملکت سے ''سیکولر'' ریاست میں منتقل ہو جائے گا؟

اے میرے والدِ مکرم! آپ کے بارے میں قائداعظم محمد علی جناح نے ارشاد فرمایا تھا کہ علامہ اقبال ان چند ہستیوں میں سے ایک تھے جو مسلمانانِ برصغیر کے قدیم اوطان میں ''اسلامی ریاست'' قائم کرنا چاہتے تھے۔

''اسلامی'' یا ''مسلم'' ریاست کے کئی نمونے (ماڈل) آج کے زمانہ میں موجود ہیں۔ مثلاً ترکی ماڈل، سعودی ماڈل، ایرانی ماڈل یا سابقہ طالبان ماڈل۔ اسی طرح تاریخ اسلام میں خلفائے راشدین کے عہد سے لے کر ترکی میں خلافت کے خاتمہ تک (۶۳۲ء تا ۱۹۲۴ء) کئی ماڈل نظر آتے ہیں۔ ان مختلف نمونوں کو دیکھ کر گمان ہوتا ہے کہ دراصل اسلامی ریاست کی کوئی حتمی شکل نہیں ہے بلکہ مختلف شکلوں میں مسلسل وجود میں آتے رہنے کے عمل کا نام ہے۔ اس اعتبار سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اسلامی ریاست کبھی مکمل صورت میں وجود میں آئی تھی۔ البتہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اسلامی ریاست ایک ''آئیڈیل'' ہے جس کے حصول کے لیے ہر مسلم ریاست کو اپنی کوششیں جاری رکھنی چاہئیں۔ کیا یہ سوچ

درست ہے؟

ایک اور قابل ذکر بات جو تاریخ اسلام کے مطالعے سے ظاہر ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ اسلامی ریاست کا ''سیاسی ڈھانچہ'' خواہ کسی نوعیت کا ہو، وہ وجود میں تبھی آتی ہے جب اس میں قوانین اسلام (شریعت) کا نفاذ ہو۔ اس لیے کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ اس مسئلے کو پورے طور پر سمجھنے کے لیے اسلامی ریاست کے ''سیاسی ڈھانچے'' اور اس کے ''قانونی ڈھانچے'' کا علیحدہ علیحدہ جائزہ لیا جائے؟

رسول اللہ ﷺ کے عہد نبوت و امامت میں اسلامی ریاست کے سیاسی ڈھانچے یا دستور کی ایک تحریری مثال جو ہمیں ملتی ہے وہ ''میثاق مدینہ'' ہے اور کیا ''میثاق مدینہ'' بنیادی طور پر ایک ''معاشرتی معاہدہ'' نہ تھا؟ بعدازاں خلفائے راشدین کے عہد میں ہمیں کم از کم چار سیاسی ڈھانچوں کی شکلیں دکھائی دیتی ہیں۔ یعنی انتخاب (الیکشن)، نامزدگی (نامینیشن)، انتخاب بذریعہ انتخابی ادارہ (الیکٹورل کالج) اور بذریعہ استصواب رائے (ریفرنڈم)۔ بعد کے سیاسی ڈھانچوں کی شکل یا تو مختلف نوع کی مطلق العنان موروثی حکمرانی ہے یا غصب اقتدار کے ذریعے وجود میں آنے والے امراء یا سلاطین۔

اے والد محترم! اس پس منظر میں آپ کی تحریروں سے میں نے اسلامی ریاست سے متعلق آپ کا ''ماڈل'' اخذ کرنے کی سعی کی ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ بعض مسلم ممالک میں منتخب قانون ساز اسمبلیوں کا قیام اسلام کی اصل پاکیزگی کی طرف رجوع ہے۔ آپ نے اپنے اشعار میں جمہوریت یا خصوصی طور پر مغربی جمہوریت (جو عوام کی حاکمیت، حقوق انسانی کے تحفظ اور قانون کی بالادستی پر قائم ہونے کی دعویدار ہے) پر سخت اعتراضات کیے ہیں۔ مگر اس کے باوجود جب علی گڑھ یونیورسٹی کے طلبہ نے آپ سے سوال کیا کہ آپ جمہوریت کی موجودہ شکل کو، اس کی خامیوں پر اعتراضات کرنے کے باوجود، کیوں قبول کرتے ہیں؟ تو آپ کا جواب تھا کہ اس کا نعم البدل آمریت یا مطلق العنانیت ہے جو اسلام کی روح کے خلاف ہے۔

اگر اسلامی جمہوریت کا تصور ہم ''شوریٰ'' والی آیت (سورۃ ۴۲ آیت ۳۸) سے اخذ کرتے ہیں تو اسلامی تاریخ میں شوریٰ کا رول ہمیشہ امام (خواہ وہ کسی قسم کے انتخابی طریقہ یا غیر انتخابی طریقہ سے سربراہ بنا ہو) کو صرف مشورہ ''دینا'' ہے اور امام اس مشورے کا پابند نہیں۔ اس کی مرضی ہے مشورہ قبول کرے یا رد کر دے۔

اس آیت کی صحیح معنوں میں ''جمہوری'' تفسیر ہمیں صرف خوارج کے ہاں ملتی ہے جن کا نظریہ تھا کہ شوریٰ کا اصل کام ''آپس میں'' مشورہ کر کے اُمّہ کے مسائل حل کرنا ہے اور شاید یہی اس آیت کا صحیح مفہوم بھی ہے۔ اس لیے ان کے نزدیک خلیفہ کا تقرر بطور سربراہ صرف فرض کفایہ ہے۔ ضرورت پڑے تو شوریٰ اسے منتخب کر سکتی ہے اور مزید یہ کہ ضروری نہیں کہ خلیفہ یا امام اہل بیت یا قریش میں سے ہی ہو، بلکہ اس منصب کے لیے ایک سیاہ حبشی غلام یا عورت بھی موزوں ہیں بشرطیکہ وہ اہلیت

رکھتے ہوں۔ سو اس اعتبار سے تاریخ اسلام میں اصل ''سوشل ڈیموکریٹس'' تو خوارج ہی تھے جنھیں ابتدائی دور ہی میں اسلام سے خارج کر دیا گیا اور اس لیے ''خارجی'' کہلائے۔

مسلمانوں کی جدید تاریخ میں سید جمال الدین افغانی پہلی شخصیت تھے جنہوں نے ترکی میں سلطان (خلیفہ) عبدالحمید کو شوریٰ یا اسمبلی کے مشورے کا پابند کرنے کی کوشش کی۔ یعنی ''آئینی یا دستوری خلافت'' کا تصور پیش کیا جو وقت کے جدید تقاضوں کے مطابق نیا اجتہاد تھا۔ مگر سلطان عبدالحمید نے اُن کے خلاف شیخ الاسلام سے کفر کا فتویٰ جاری کروا دیا۔ شیخ الاسلام کا استدلال مختصراً یہ تھا کہ اسلام کی صدیوں پرانی سیاسی روایت کے مطابق، سورۃ ۴ آیت ۵۹ کے تحت مسلمانوں پر بلاشرط اطاعت ''اُولِی الْاَمْرِ'' فرض ہے۔ نیز اسی روایت کے مطابق شوریٰ امام کو صرف مشورہ ''دے'' سکتی ہے۔ لیکن شوریٰ کے ''آپس میں'' مشورے کا امام کو پابند کرنے والے سب کے سب سرکش اور کافر ہیں۔

اے والدِ محترم! آپ سید جمال الدین کو موجودہ عہد کا مجدد سمجھتے تھے اس لیے جب ۱۹۲۴ء میں ترکی میں خلافت منسوخ کر دی گئی تو آپ نے ترکوں کے اجتہاد، کہ خلیفہ کے تمام اختیارات منتخب مسلم اسمبلی کو منتقل ہو گئے ہیں، کی تائید کی۔ پس کیا یہ کہنا درست نہ ہوگا کہ آپ کی جدید اسلامی ریاست عوام کے ووٹوں کے ذریعے منتخب نمایندوں کی مجلسِ قانون ساز کے قیام، حقوقِ انسانی کے تحفظ اور قانون کی بالادستی کے اصولوں پر ہی قائم ہو سکتی ہے؟

آپ کے نزدیک ''توحید'' کا مطلب انسانی اتحاد، مساوات اور آزادی کی بنیادوں پر زمان و مکان کے اندر ایک مثالی معاشرہ وجود میں لانا ہے۔ اسی بنا پر خطبہ الہ آباد (۱۹۳۰ء) میں آپ نے سورۃ ۲۰ آیت ۴۰ کے حوالے سے اعلان کیا تھا کہ مجھ پر اقلیتوں کی عبادت گاہوں، قوانین اور تمدن کے تحفظ کا فرض عائد کیا گیا ہے۔ اسی ضمن میں آپ نے مزید فرما رکھا ہے کہ اسلام کا اصل مقصد ''روحانی جمہوریت'' کا قیام ہے۔

اے پدرِ محترم! آپ نے وضاحت نہیں کی کہ ''روحانی جمہوریت'' سے آپ کی کیا مراد ہے؟ کیا اس تصور کی بنیاد آپ ''میثاقِ مدینہ'' پر رکھتے ہیں یا سورۃ ۵ آیت ۵۸ پر جس میں مختلف مذاہب کے لوگوں کو تلقین کی گئی ہے کہ ایک دوسرے سے نیک کام انجام دینے میں سبقت حاصل کرو اور یہ کہ جب تم سب اللہ تعالیٰ کے روبرو لائے جاؤ گے تو وہ بتائیں گے کہ تمھارے آپس میں اختلافات کیا تھے؟

آپ کی طرف سے وضاحت کی عدمِ موجودگی کے سبب بعض اقبال شناس آپ کے تصورِ ''روحانی جمہوریت'' کو صرف مختلف مسلم فرقوں میں رواداری تک محدود رکھتے ہیں اور اس میں غیر مسلموں کو شریک نہیں کرتے۔ حالانکہ جب یہ اصطلاح استعمال کی گئی، آپ مقتدر مسلم ریاست، جس کے اندر ''روحانی جمہوریت'' قائم ہونی تھی، کا ذکر اپنے خطبے میں فرما چکے تھے۔ بلکہ سید نذیر نیازی کو

اپنے خط میں تحریر بھی کر دیا تھا کہ میری مجوزہ مسلم ریاست میں جو برصغیر کے شمال مغرب میں قائم ہو گی آبادیوں کے تبادلے کی ضرورت نہیں یعنی اس ریاست میں غیر مسلم بھی موجود ہوں گے۔ اس لیے کیا آپ کی ''روحانی جمہوریت'' کا یہ مطلب نہیں کہ مجوزہ ''اسلامی'' ریاست میں بلاتفریق مذہب، ذات پات، رنگ، نسل، زبان سب برابر کے شہری تصور کیے جائیں گے؟ غالباً اسی پس منظر میں آپ نے پنجاب کونسل کی ممبری کے زمانے میں ''توہین بانیانِ ادیان'' کا قانون پاس کرانے کی کوشش کی تھی؟

آپ کی مجوزہ ''اسلامی'' ریاست میں اسلام کیسے نافذ کیا جائے گا؟ ایک جگہ کہتے ہیں:

جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

کسی اور مقام پر فرمایا ہے:

دینِ ملّا فی سبیل اللہ فساد

اے میرے پدرِ محترم! دین کی وہ کونسی تعبیر ہے جو ریاست کو معاشی نا انصافی اور ظلم سے محفوظ رکھتی ہے؟ اور وہ کون سی تعبیر ہے جو شر اور فساد کا سبب بنتی ہے؟ نیز جو تعبیر شر اور فساد کا باعث بنتی ہے اس کے تدارک کے لیے کیا طریق کار اختیار کرنا چاہیے؟

اس ضمن میں آپ اس تجویز کو تحسین کی نگاہ سے دیکھتے ہیں کہ ریاست کے مختلف شعبوں سے دینیات کا شعبہ الگ کر دیا جائے۔ اس شعبے کا کام مساجد اور مدرسوں کو کنٹرول کرنا ہو، مدرسوں کے لیے جدید نصاب کا تعین کرنا اور انھیں یونیورسٹیوں سے منسلک کرنا ہو۔ اسی طرح صرف حکومت کے سند یافتہ آئمہ مساجد کا تقرر اس شعبے کی ذمہ داری ہو۔ جب ترکی میں اس طرز کی اصلاحات نافذ کی گئیں تو آپ نے بڑے جوش و خروش سے ان کا خیر مقدم کیا اور فرمایا تھا کہ اگر مجھے ایسا اختیار حاصل ہو تو میں فوراً یہ اصلاح مسلم انڈیا میں نافذ کر دوں۔ کیا آپ کی نگاہ میں دینیات کے شعبے کی ریاست کے دوسرے شعبوں سے علیحدگی محض ''فنکشنل'' ہے، اس کا مطلب ''چرچ'' اور ''سٹیٹ'' کی علیحدگی نہیں ہے؟

اسی طرح دین کو کیسے ملکی سیاست کے ساتھ پیوست کیا جائے کہ ریاست ظلم اور معاشرتی نا انصافی کرنے سے باز رہے؟ اس بارے میں آپ منتخب مسلم قانون ساز اداروں یا اسمبلیوں کو ''اجتہاد'' کا اختیار دیتے ہیں۔ چونکہ آج کی مسلم اسمبلیوں کے ارکان میں سے بیشتر علمی یا تعلیمی اعتبار سے نا اہل ہیں، اس لیے آپ کی رائے میں فی الحال حکومت وقت علما کے ایسے بورڈ نامزد کرے جو اسلامی قانون سازی کے معاملوں میں پارلیمنٹ کے ارکان کے ساتھ بحث میں حصہ لیں اور ان کی رہبری کریں، لیکن کسی ایسے اسلامی بل پر اُنہیں ووٹ ڈالنے کا حق نہ ہو۔ آپ کے خیال میں یہ طریقِ کار صرف عارضی طور پر اپنایا جانا چاہیے۔ صحیح طریقہ یہی ہو گا کہ قانون کی تعلیم دینے والے اداروں، لا کالجوں اور یونیورسٹیوں کے قانونی نصاب میں اصلاح کی جائے اور اس میں اسلامی فقہ کے ساتھ جدید جورس

پروڈنس کا تقابلی مطالعے کا موضوع شامل ہو۔ اس موضوع میں مہارت حاصل کرنے والے وکلا ٹیکنو کریٹس کی حیثیت سے مختلف جدید علوم (مثلاً اقتصادیات، بینکنگ وغیرہ) کے غیر علما ماہرین کے ساتھ سیاسی جماعتوں کے ٹکٹ پر منتخب ہو کر پارلیمنٹ میں لائے جائیں۔ تبھی مسلم اسمبلی صحیح معنوں میں ''اجماع'' کی صورت میں اسلامی قانون سازی کے معاملے میں ''اجتہاد'' کے قابل ہو سکے گی۔

اے میرے پدر محترم! اس مرحلے پر دو ایک باتیں قابلِ غور ہیں۔ آپ نے اپنی زندگی میں برصغیر کے صرف چند علما کے علاوہ باقیوں کے علم کے متعلق کچھ اچھے خیالات کا اظہار نہیں کیا۔ اگرچہ ہماری اسمبلیوں کے منتخب رکن نا اہل ہیں، کیا آپ سمجھتے ہیں کہ خطہ پاکستان میں ایسے جیّد علما موجود ہیں جو اسلامی قانون سازی کے موقعوں پر ارکان اسمبلی کی مثبت رہبری کر سکیں؟

میری اپنی چیف ججی کے زمانے میں بادشاہی مسجد میں ایک مناظرہ غالباً دیوبندی اور بریلوی فرقوں کے علما کے درمیان ہوا تھا۔ اس موقع پر کسی نا معلوم شخص نے کوئی نا مناسب نعرہ لگا دیا جس پر دونوں گروہوں میں مسجد کے اندر اور باہر خاصی مار کٹائی ہوئی اور بعض علما زخمی بھی ہوئے۔ نتیجہ میں صوبائی حکومت نے اس واقعے کی انکوائری کرنے کی خاطر مجھے ہائی کورٹ کے جج کا تقرر کرنے کی سفارش کی۔ میں نے جسٹس شیخ ریاض احمد (موجودہ چیف جسٹس پاکستان) کو یہ ذمہ داری سونپی۔ انھوں نے اس معاملے کے بارے میں اپنی رپورٹ حکومتِ پنجاب کو دی جو آج تک شائع نہیں ہوئی۔ لیکن ایک بات جو ان کی وساطت سے میرے علم میں آئی وہ یہی تھی کہ واقعے کے متعلق علما حضرات کے بیانات میں اتنا تضاد تھا کہ کسی نتیجے پر پہنچ سکنا ممکن نہ تھا۔ چیف جسٹس محمد منیر بھی اپنی معروف ''منیر کمیٹی رپورٹ'' میں کچھ ایسے ہی نتیجے پر پہنچے تھے۔ ان حالات میں نئی اسلامی قانون سازی کے لیے ''اجتہاد'' کے بارے میں ان کی رہبری پر کس حد تک اعتماد کیا جا سکتا ہے؟

دوسری بات یہ ہے کہ پاکستان ایک ''قومی ریاست ہے۔ اگر اس کی منتخب اسمبلیاں اسلامی قانون سازی کے لیے اجتہاد کا طریقہ اختیار کرتی ہیں تو کیا ایسے نئے اسلامی قوانین کا اطلاق صرف پاکستان کی سرحدوں تک محدود نہ ہوگا؟ اور کیا یوں فقہ کا ایک نیا ''نیشنل'' مدرسہ وجود میں نہ آ جائے گا؟

آپ کے ہاں اسلام کے نفاذ کے لیے سب سے زیادہ زور تعلیمی اداروں میں اسلامی اخلاقیات کی تربیت دینے پر ہے۔ اس کے لیے صرف صوم وصلوٰۃ کی مکینیکل پابندی ہی کافی نہیں۔ بلکہ انسان دوستی، رواداری، حلم، عجز، سادگی ایسی خصوصیات کی ترغیب کے ساتھ طلبہ اور طالبات میں تجسس کا جذبہ پیدا کرنا ہے تاکہ وہ اپنے اپنے علوم کے ذریعے اختراع اور ایجاد کا منقطع سلسلہ از سرِ نو جاری رکھ سکیں۔ آپ کی نگاہ میں طبعیات، ریاضیات یا سائنس کے دیگر موضوعات میں دلچسپی لینا بھی ایک طرح کی عبادت ہے کیونکہ مشاہداتی علوم کا مطالعہ دراصل فطرت یا قدرت کا مطالعہ ہے جو اللہ تعالیٰ سے قربت کا سبب بنتا ہے۔

آپ نے تفصیل سے نہیں بتایا کہ کن اسلامی قوانین کے بارے میں اجتہاد کی ضرورت ہے بلکہ آپ نے یہ کہہ کر خاموشی اختیار کر لی کہ ہماری قوم بڑی قدامت پسند اور حسّاس ہے۔ لوگ چھوٹی چھوٹی باتوں پر ناراض ہو جاتے ہیں اور یہ کہ ''اس وقت'' متنازع امور پر بحث کرنے کی بجائے مسلمانوں کو آزادی حاصل کرنے کی خاطر ''اتحاد'' کی ضرورت ہے نہ کہ ''اجتہاد'' کی۔ ساتھ یہ بھی فرما دیا کہ محکومی کے دور میں اجتہاد کی بجائے ''تقلید'' کا راستہ اختیار کرنا ہی بہتر ہے۔ مگر اے پدرِ محترم! کیا ہم اب بھی صحیح معنوں میں آزاد ہیں یا ابھی تک محکومی کے دور ہی سے گزر رہے ہیں؟

ان حقائق کے باوجود آپ کی تحریروں میں بعض اشارے ایسے ملتے ہیں جن سے اجتہاد کے بارے میں بحیثیت مجموعی آپ کے رجحانات کا پتا لگایا جا سکتا ہے۔ مثلاً آپ کی رائے خاندانی منصوبہ بندی سے متعلق قانون سازی کے حق میں ہے۔ آپ ایک سے زائد ازدواج کے امتناع کو شرعاً جائز قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ معاشرتی حالات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اسلامی ریاست کا سربراہ کسی بھی قرآنی حکم یا اجازت کی تعویق، تجدید یا توسیع کر سکتا ہے۔

مولانا شبلی کی طرح آپ مسلمانوں میں فری مارکیٹ اکانومی کے فروغ کی خاطر بینکوں کے منافع کو ربٰو کے زمرے میں نہیں لاتے۔ آپ چونکہ جاگیرداری کو مناسب حدود میں رکھنے کے قائل ہیں، اس لیے پنجاب کونسل کی رکنیت کے زمانے میں آپ نے سرکاری اراضی بے زمین مزارعین یا کسانوں کو آسان اقساط میں بیچنے کے ساتھ، جاگیرداروں پر اگریکلچرل انکم ٹیکس لگانے کی تجاویز پیش کیں۔ آپ کے خیال میں زمیندار صرف اتنی زمین کی ملکیت کا حقدار ہے جتنی وہ بذاتِ خود کاشت کر سکے۔ اسی طرح قرآنی حکم "قُـل الـعـفـو" (سورۃ ۲ آیت ۲۱۹) کے تحت آپ حکومت کو ٹیکس لگانے کے ایسے اختیارات دینا چاہتے ہیں کہ جو صاحبِ ثروت ہر سرمایہ دار یا کارخانہ دار سے اس کی انفرادی ضرورت سے زائد دولت حاصل کر کے مزدوروں اور ان کے بچوں کی فلاح و بہبود پر صرف کی جا سکے۔ چونکہ آپ ''کیپیٹلزم'' اور ''کمیونزم'' دونوں معاشی نظاموں کے خلاف ہیں اس لیے آپ ''کیپیٹلزم'' اور ''فیوڈلزم'' کو مناسب حدود میں رکھتے ہوئے اپنی مجوزہ اسلامی ریاست میں زکوٰۃ صدقات اور عشر کی تنظیم نیز اسلامی قانونِ وراثت کے سختی سے اطلاق کے علاوہ ایسی تمام سوشل اصلاحات نافذ کرنے کے حق میں ہیں جن کے ذریعے متوسط طبقے کی فلاحی ریاست وجود میں لائی جا سکے۔

جہاں تک اسلامی کریمینل لا (حدود) کا تعلق ہے آپ مولانا شبلی کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے سمجھتے ہیں کہ چونکہ ان ''سزاؤں'' کا اصل مقصد محض سزائیں دینا نہیں، بلکہ معاشرے میں جہاں تک ممکن ہو جرائم کی بیخ کنی کرنا ہے۔ اس لیے آیندہ نسلوں پر ضروری نہیں کہ ایسے قوانین کا سختی سے اطلاق کیا جائے۔ اس مرحلے پر کیا یہ کہنا درست نہ ہو گا کہ اپنی مجوزہ ''اسلامی'' ریاست میں آپ اسلامی معاشی ''برکات'' سے متعلق قانون سازی کو اسلامی ''تعزیرات'' سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں؟

اے پدرِ محترم! اگرچہ آپ کی مجوزہ ''اسلامی'' ریاست کا خاکہ ہر اعتبار سے مکمل نہیں، مگر اس حقیقت سے انکار کر سکنا مشکل ہے کہ اس کا نمونہ ماضی یا حال کے تمام ایسے نمونوں سے مختلف ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ ماڈل قابلِ عمل ہے تو اسے کون وجود میں لائے گا؟

آپ ہمیشہ جوانوں سے مخاطب ہوتے تھے۔ انھیں پیروں کا استاد دیکھنا چاہتے تھے۔ آپ چاہتے تھے کہ خداوند تعالیٰ آپ کا عشق اور آپ کی نظر انھیں عطا کر دے۔ اسی سبب آپ اپنے آپ کو آنے والے کل کا شاعر و مفکر سمجھتے تھے۔

اے کاش! میں اُن نوجوانوں میں سے ہوتا جو آپ کی مجوزہ ''اسلامی'' ریاست کو عملی طور پر وجود میں لا سکنے کے قابل تھے۔ مگر میری نسل، جس نے پاکستان بنتے، ٹوٹتے اور پے در پے مشکل ادوار میں سے گزرتے دیکھا، ایک مایوس نسل ہے۔ میں اپنی کوتاہیوں سے بخوبی آگاہ ہوں۔ میں نہ اچھا مصور بن سکا، نہ اچھا ادیب، نہ اچھا سیاستدان، نہ اچھا وکیل، نہ اچھا جج، نہ اچھا شوہر، نہ اچھا باپ۔ میری زندگی میں آسودگی میری اپنی محنت کا ثمر نہیں بلکہ میری رفیقۂ حیات کی مشقت کا نتیجہ ہے۔ میں تو اپنے بچوں کو بھی وہ شفقت و محبت نہ دے سکا جس کے وہ مستحق تھے۔

آپ کو یاد ہو گا جب اس دنیا میں آپ کی آخری شب تھی۔ میں کمرے میں داخل ہوا تو آپ مجھے پہچان نہ سکے پوچھا: ''کون ہے؟'' میں نے جواب دیا: ''جاوید۔'' فرمایا: ''جاوید بن کر دکھاؤ تو جانیں!'' افسوس ہے، میں آپ کی خواہش کے مطابق ''جاوید'' نہ بن سکا۔

اور بنتا بھی کیسے؟ آپ نے خود ہی ''جاوید نامہ'' (خطاب بہ جاوید) میں میرے ذریعے میری نسل کے مایوس جوانوں کو ارشاد فرمایا تھا:

ترسم ایں عصرے کہ تو زادی دراں　　در بدن غرق است و کم داند ز جاں!
چو بدن از قحطِ جاں ارزاں شود　　مردِ حق در خویشتن پنہاں شود!
در نیابد جستجو آں مرد را　　گرچہ بیند روبرو آں مرد را!
تو مگر ذوقِ طلب از کف مدہ　　گرچہ در کارِ تو افتد صد گرہ!

میں اُس زمانے سے ڈرتا ہوں جس میں تم پیدا ہوئے۔ کیونکہ یہ زمانہ جسم میں غرق ہے اور روح کو نہیں پہچانتا۔ جب روح کے قحط کے سبب جسم ارزاں ہو جائیں تو مردِ حق اپنے اندر چھپ جایا کرتا ہے۔ اسے ڈھونڈنے کی کوشش کرو تو دکھائی نہیں دیتا حالانکہ تمھارے سامنے ہوتا ہے۔ مگر تم اس کی تلاش کے لیے اپنی تگ و دو جاری رکھو خواہ تمھیں کتنی ہی صعوبتیں برداشت کرنی پڑیں۔

اے پدرِ محترم! ایک ''مردِ حق'' جسے آپ ہی نے ہمارے لیے منتخب کیا تھا، کی قیادت میں ہم نے پاکستان حاصل کر لیا۔ بعد ازاں جو بھی ''مردانِ و زنانِ حق'' ہمیں میسر آئے، آپ خود ہی بتائیے، کیا وہ آپ کے قائم کردہ معیار پر پورے اترتے تھے؟ پھر بھی آپ کے فرمان کے مطابق، ہم شجر سے پیوستہ

ہیں، امید بہار رکھتے ہیں۔

اے پدرِ محترم! منیب، ولید اور اُن کی نسل کے آزردہ نوجوان مجھ سے پوچھتے ہیں کہ اگر تلاش کے باوجود کوئی ''مردِ حق'' نہ ملے، اگر کسی باخبر مرد کی صحبت ہمیں میسر نہ آئے، اگر صحیح قیادت ہمارے نصیب میں نہ ہو، تو ہم کیا کریں؟ میں انھیں وہی پیغام دے سکتا ہوں جو آپ نے مجھے ''جاوید نامہ'' کے آخری حصہ ''خطاب بہ جاوید'' میں دے رکھا ہے۔

غم اور دلگیری ایمان کی کمزوری ہے۔
غم نصف پیری ہے۔
نوجوانو! جب تک تم غیر اللہ سے لالچ رکھتے ہو
اور جب تک اس سے کچھ نہ ملنے کے غم سے تم آزاد نہیں ہو جاتے
تمھارے مسائل حل نہ ہوں گے۔ تم جاوید نہ بن سکو گے۔
یاد رکھو! حرص ہمیشہ کی محتاجی ہے
پس اپنے اوپر ضبط رکھو۔

خیر اندیش
یکے از فرزندانِ اقبال

❁ ❁ ❁